

اشارات

ہر ذات متصف کے لیے اپنے اوصاف کی حیثیت سے دو کمال ہوا کرتے ہیں۔ ایک کمال تو یہ ہے کہ وہ جس صفت سے متصف ہے اس میں اوصاف کی انتہا کو پہنچ جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی ذات میں صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسری ذات تک متعدی ہو اور دوسروں کو بھی اسی صفت کے رنگ میں رنگ دے۔ برف کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا ہیچ کی سرد ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ دوسری چیزوں کو بھی سرد کر دیتی ہے۔ آگ کا کمال اول یہ ہے کہ وہ خود انتہا ہیچ کی گرم ہے۔ اور کمال ثانی یہ کہ وہ آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی اسی کیفیت سے متکثیف کر دیتی ہے۔ بالکل ہی حال نیکی اور بدی کا بھی ہے۔ نیک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا محترم بن جائے۔ اور دوسرا کمال یہ کہ وہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنا دے۔ اسی طرح بُرے آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود بدی کی صفت سے بدرجہ اتم متصف ہو۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی اس بدی کو دوسروں تک متعدی کر دے۔

اس قاعدہ کلیہ کے مطابق کافر اور مومن کے لیے بھی کمال کے دو مرتبے ہیں۔ کافر اگر بجائے خود اپنے عقیدہ کفر میں راسخ اور مضبوط ہو تو وہ کمال کفر کے پہلے مرتبے میں ہے۔ اور اگر وہ کفر کی تبلیغ کرے، لوگوں کو راہ حق سے روک کر باطل کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کرے، اور اپنے زورِ بیان، یا زورِ مال، یا زورِ مشیر یا کسی دوسرے زور سے کفر کی اشاعت کرے، تو وہ کمال کفر کے دوسرے مرتبے کی بھی تحصیل کر لیتا ہے، اور ان دونوں مرتبوں کو جمع کرنے کے بعد اس کے لیے کمال کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اسی طرح مومن اگر خود اپنے عقیدہ ایمان میں راسخ، اور اطاعت حق میں کامل ہو تو وہ کمال ایمان کے پہلے مرتبے پر فائز ہو گا۔ اور اگر اس میں یہ صفت اتنی شدید ہو جائے کہ وہ دوسروں میں بھی ایمان اور اطاعت حق کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے، اور دوسرے بندگان خدا کو بھی اپنی زبان یا اپنے قلم، یا اپنے روپ یا اپنے دست و بازو یا اپنے

اور وسائل سے ایمان و اسلام کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرے، تو اس کو کمال ایمان کا دوسرا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد وہ پورا مومن کہلائے جانے کا مستحق ہوگا۔

اس ضمن میں سورہ اہل عمران کے دسویں اور گیارہویں اور بارہویں رکوع میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ - کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو؟

پھر فرمایا:-

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَقْعُدُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبِعُونَهَا عَوَجًا - کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس راہ کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو؟

یہ دونوں آیات صاف طور پر دلالت کرتی ہیں کہ کفر کا پہلا کمال، آیات الہی کا خود منکر ہونا ہے، اور دوسرا کمال اس کفر کی اشاعت کرنا، اور لوگوں کو خدا کے سیدھے راستے سے روکنا، اور اعتقاد و عمل کے ٹیڑھے راستے ان کے سامنے پیش کرنا ہے۔

اس کے بعد مومنوں سے خطاب شروع ہوتا ہے، اور ان سے بھی دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ:-
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۚ وَلَا تَحْزَنْهُمْ غَوْلُ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا
اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب کے سب مل کر اللہ کی رتی کو پکڑے رہو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔

دوسرے یہ کہ:-

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَأَوْقِفُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا نُفِخُ فِي سُرُورٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ

يَا مَرُوفٌ بِالْعَرُوفِ وَيَتْلُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔
جو نیکی کی طرف بلائی ہو اچھے کام کا حکم دیتی ہو اور بُرے
کام سے روکتی ہو۔ اور فلاح پانے والے ایسے ہی لوگ ہیں۔

یہاں ایمان کے بھی دو درجے بتا دیے ہیں۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مومن خود اللہ سے ڈرنے والا ہو،
اور مرتے دم تک اوامرِ الہی کا مطیع رہے، اور اللہ کی رستی کو مضبوط تھامے رکھے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے
کہ وہ اپنے دوسرے اپنائے نوع کو بھی نیکی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے۔

پھر کمالِ ثانی کے اندر بھی بہت سے مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مومن تہی، بجلی کا قمتقہ، چاند اور
سورج، سب پر مبنی اور روشن گرہوں کے اطلاق ہوتا ہے، مگر روشن گری میں ان کے مدارج، ہتفاوتہ ہیں۔
مومن تہی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے بجلی کے قمتقے کی روشنی ایک بڑے مکان کی حد تک پھیل سکتی
ہے، چاند کی روشنی زمین اور اس کے ارد گرد کی فضا تک محدود ہے۔ مگر سورج تمام عالم کو اپنی روشنی سے
چمکا رہا ہے۔ اور ہمارا پورا نظام شمسی اس کی روشنیوں سے منور ہے۔ اسی طرح مومن اپنے جیسے ایک
انسان کے دل میں بھی ایمان کی شمع روشن کر دے تو وہ کمالِ ثانی کے مرتبے میں داخل ہو جائے گا۔
لیکن یہ اس کمال کا پہلا درجہ ہو گا۔ پھر ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک میں دعوت الی الخیر کے
مدارج ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت الی الخیر تمام عالمِ انسانی کے لیے عام ہو۔ وہ ساری
دنیا کو نیکی کی طرف بلائے۔ پورے رُبحِ مسمکوں میں اللہ کا فوجدار بن جائے، بدی اور منکر جہاں بھی ہو،
اس کے استیصال کے لیے آستین بٹھالے۔ اور اپنے آپ کو کسی خاص برادری کہی خاص قوم، کسی خاص
ملک، اور کسی خاص نسلی، یا جغرافی حد کے اندر محدود نہ سمجھے۔ یہ کمالِ ایمان کا سب سے بڑا اور سب سے اونچا
درجہ ہے۔ اور چونکہ حضرت خلیجِ مجدہ نے ہر محلے میں مسلمانوں کے سامنے ایک بلند سطحِ نظر پیش فرمایا
ہے۔ اور کسی جگہ لپٹ جھلکی کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اس لیے آگے چل کر بارہویں رکوع میں، ان کو بتایا ہے
کہ تم کمالِ ایمان کے اسی آخری درجے تک پہنچنے کے لیے ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم

نیکی کا حکم دیتے ہو۔ بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ثُمَّ أَهْرُوفَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ - (۱۲: ۳)

آیت۔ وَتُكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ... الخ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے اور اس اختلاف کا منشا لفظ مِنْكُمْ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ مِنْ یہاں تبعیض کے لیے نہیں بلکہ تبیین کے لیے آیا ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں وہ تبعیض ہی کے لیے آیا ہے۔

پہلے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا ہے جیسا کہ فرمایا اَلْأُمَّةَ خَيْرًا لِّلنَّاسِ... الخ اور حقیقت میں ہر مکلف ہستی پر واجب ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور بدی کو دفع کرے، خواہ ہاتھ سے کرے یا زبان سے کرے یا اور کچھ نہ ہو سکے تو قلب ہی سے کرے۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم ایسی امت ہو جاؤ جو خیر کی طرف بلاتی اور برائی سے روکتی ہو، کیونکہ مِنْ یہاں تبیین کے لیے ہے، اور اس کی مثال یہ آیت ہے: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (یعنی بتوں کی گندگی سے بچو نہ یہ کہ بتوں میں سے اس چیز سے بچو جو گندگی ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مِنْ یہاں تبعیض کے لیے آیا ہے، اور اس کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں میں ایک بڑا حصہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مرضیوں پر مشتمل ہے جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کچھ شرائط ہیں جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے لیے خیر اور معروف اور منکر کا صحیح علم درکار ہے اس کے لیے حکمت اور عقل کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آدمی پہلے خود کمالِ ربّی کا منتفی اور پرہیزگار ہو، تب لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دے (دیکھو مفاتیح الغیب للامام الزمخشری وغریب القرآن للنیسابوری، والوار التشریل للبیضاوی)

مگر کتاب اللہ اور سنت رسول میں تاویل کرنے سے یہ اختلاف باسانی دور ہو سکتا ہے۔

ہم نے اوپر کلام اللہ سے مومن کے لیے دو کمال ثابت کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا کمال یعنی خوفِ خدا اور اوامرِ الہیہ کے آگے سر جھکا دینا اور اللہ کی رستی کو مضبوط تھامے رہنا تو ذاتِ مومن کے ساتھ صفتِ ایمان کے نفسِ قیام کے لیے ضروری ہے۔ لہذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی مرتبے کا متحقق ہونا لازم ہے کہ اگر وہ اس میں متحقق نہ ہو تو وہ مومن ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہ ہوگا۔ اگر برف میں سردی نہ ہو تو وہ برف ہی نہ ہوگی۔ اگر آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کو خطاب کر کے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ **إِتَّقُوا اللَّهَ حَتَّى تُقَاتِلُوهُ** اور **وَلَا تَمُوتُوا إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** اور **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ اس آیت میں تبعیض کا نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ عموم کے ساتھ تاکید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہئیں۔

دہا دوسرا کمال تو وہ کمالِ ناید ہے جس کا متحقق ہونا، مومن کے مومن ہونے کے لیے نہیں، بلکہ اس کے کامل و مکمل اور بلند مرتبہ و عالی شان مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اب اس کمال کے اعتبار سے ایک قوم کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حالت تو یہ ہے کہ پوری قوم کی قوم اس صفت کی حامل اور اس مرتبہ کمال پر فائز ہو۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ قوم کے کم از کم ایک حصہ میں کمالِ ایمان کا یہ اعلیٰ مرتبہ متحقق ہو اور باقی افراد صرف کمالِ اول سے متصف رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم پہلی حالت میں ہو یعنی اگر تمہاری پوری قوم دنیا میں آفتابِ ہدایت بن جائے، اور تمام اقوامِ عالم کو نیکی کا حکم دینے والی اور بدی سے روکنے والی ہو، تو تم دنیا کی بہترین امت ہو گے۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَذُووْا الْحَقِّ بِاللَّهِ**۔ لیکن اگر تم میں اس اعلیٰ مرتبے کی بہت نہ ہو اور پوری قوم اس صفت سے متصف نہ ہو سکے، تو پہلے اندر کم از کم ایک گروہ تو ایسا رہنا ہی چاہیے جو غیر کی طرف بلاتا رہے اور بدی سے روکتا رہے۔ **وَلْتَلِّنْ رُمَّنًا مِّنْهُ** **يَذْعُرْنَ إِلَى الْخَيْرِ** الخ۔ اسی لیے پہلی آیت میں عموم ہے مگر تاکید نہیں اور دوسری آیت میں تاکید

ہے مگر عموم نہیں۔

کمال ایمان کے یہ دو درجے، جن کا بار بار ذکر آ رہا ہے۔ صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں تو دونوں ایک ہی ہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا، اور جو اللہ سے ایسا ڈرنے والا ہوگا جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اس کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو گمراہی میں مبتلا دیکھے اور اسے راہ حق کی طرف دعوت نہ دے۔ کہیں بدی کا وجود پائے اور اس کو مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ طبیعت مومن کی مثال ایسی ہے جیسے مشک، کہ رائحۃ ایمان اس کے غرم تک محدود نہیں رہتی بلکہ پھیلی ہوئی ہے جہاں تک پھیلنے کا اس کو موقع ملے یا چراغ کہ نور ایمان سے جہاں وہ منور ہوا، اور اس نے اس پاس کی فضا میں اپنی شعاعیں پھیلا دیں۔ مشک میں جب تک خوشبو ہے گی وہ مشامِ جان کو معطر کرتا رہے گا۔ چراغ جب تک روشن رہے گا روشن کرتا رہے گا۔ مگر جب مشک کی خوشبو قریب سے قریب سونگھنے والے کو بھی محسوس نہ ہو، اور چراغ کی روشنی اپنے قریب ترین ماحول کو بھی روشن نہ کرے تو ہر شخص یہی حکم لگائے گا کہ مشک، مشک نہیں رہا۔ اور چراغ اپنی چراغیت کھو چکا ہے۔ یہی حال مومن کا ہے، کہ اگر وہ غیر کی طرف دعوت نہ دے، نیکی کا حکم نہ دے، بدی کو برداشت کرے اور اس سے روکے نہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں خوفِ خدا کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور ایمان کی روشنی مدہم ہو گئی ہے۔

اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو لازم ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان ہی سے سہی، اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو بُرا سمجھے اور اس کے مٹانے کی خواہش رکھے، کیونکہ یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ اور اسی لیے قرآن مجید میں مومنوں کی عام صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ لَعُظَمُهُمْ وَآلِیُّهُمْ
لَعُظْمٌ یَّاهُمْ وَنَ بِالْمَعْرُوفِ وَیَسْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ - (۹:۹) -

الْتَّابِعُونَ الْعِبَادُونَ الْحَمِدُ لِلَّهِ
السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ
الْمَعْرُوفِ بِالْمَعْرُوفِ وَالْتَّاهُونَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَالْحَفِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ - (۱۳:۹) -
الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ -

مومن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور مددگار
ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بدی سے روکتے
ہیں۔

وہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، خدا کی حمد کرنے
والے، خدا کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع و سجود کرنے
والے، نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے
اور حدودِ الہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے ان کو زمین میں طاقت بخش
دی تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں
گے اور بدی سے روکیں گے۔

پھر جب کہ مومن کی ضروری صفات میں سے ایک صفت امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے
تو کیا وجہ ہے کہ اس کی حیثیت فرضِ کفایہ کی سی رکھی گئی، اور اس معاملے میں اتنی نرمی کی گئی کہ مسلمانوں
کی پوری قوم میں سے صرف ایک جماعت کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہونا کافی سمجھا گیا؟ اس کا
جواب یہ ہے کہ خدا عظیم و خیر کو معلوم تھا کہ عہدِ رسالت کے گزر جانے کے بعد مسلمانوں کے ایمان
ضعیف تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا یہ قوم باہل و متزلزل ہوتی جائے گی۔
حتیٰ کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ کہ مٹوں مسلمان دنیا میں موجود ہوں گے مگر ان کی شیعہ ایمان میں اتنی
روشنی بھی نہ ہوگی کہ اپنے قریبی ماحول ہی کو منور کر سکیں، بلکہ ظلمتِ کفر کے غلبے سے خود ان کے اپنے
نور کرنے بچھ جانے کا خوف ہوگا۔ لہذا ایسی حالتوں کے لیے اس نے فرمایا کہ تمہارے اندر کم از کم ایک
ایسی جماعت تو ضرور ہی موجود رہنی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دینے والی، اور بدی کا مقابلہ
کرنے والی ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے اندر ایسی ایک جماعت بھی نہ رہے تو پھر تم کو عذابِ الہی، اور قطعی

ہلاکت و تباہی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَءِيلَ
عَلَى لِسَانِ ذَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝
كَانُوا لَا يَتَنَبَّأُونَ عَنْ نَفْسِكُمْ ۙ فَعَلُوا ۚ
لَيْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝
دوسری جگہ فرمایا :-

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا
بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا
مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا
أُتُوا بِهِمْ وَكَانُوا هَٰجِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ رَبُّكَ
لِيَهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝
تم سے پہلے کی قوموں میں کچھ لوگ ایسے کیوں نہ ہوئے
جو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔ ان میں ایسے
لوگ اگر تھے بھی تو وہ بہت کم تھے سوائے کہ تم نے
نجات دے دی۔ باقی رہے ظالم لوگ تو وہ مجرم تھے،
تو اے نبی تیرا بسایا نہیں ہے کہ سستیوں کو تو یہی ظلم
سے ہلاک کر دے، ورنہ ایک دن ان کے باشندے نیکو کار ہوں۔

اس مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیان فرمایا ہے کہ :-

ان الله لا يعذب العامة لجعل خاصة
حتى يروا المنكر بين ظهرانيهم و هم
قادرون على ان ينكروا فلا ينكروا . فاذا
فعلوا ذلك عذب الله الخاصة والعامة .
اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے بُرے اعمال کی سزا نہیں
دیتا جب تک کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچ جائے کہ وہ اپنے
سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں، اور ان کو روکنے کی قدرت
رکھتے ہوں اور پھر نہ روکیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں
تو اللہ خاص اور عام سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔

(رواہ احمد)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْصُرَنَّ

بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَيْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ

لَتَأْخُذَنَّ عَلَيَّ يَدُ الْمُسْنِي وَلَتَنْظُرَنَّ عَلَيَّ

الْحَقُّ أَطْرَافًا وَلَيُصِيبَنَّ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِكُمْ

عَلَى بَعْضٍ أَوْ لَيُلْعَنَنَّ كَمَا لُعِنْتُمْ رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

وَابُودَاؤُودُ وَابْنُ مَاجَةَ بِاخْتِلَافٍ قَلِيلٍ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو، بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اسے حق کی طرف موڑ دو ورنہ اللہ تمہارے دلوں کی برائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا۔ یا تم پر اس طرح لعنت کرے گا۔ جس طرح کفار بنی اسرائیل پر کی۔

پس یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ... الخ میں جو تعبیر ہے، وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سے صرف ایک ہی ایسی جماعت مطلوب ہے جو داعی الی الخیر اور آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہو اور باقی مسلمانوں کے لیے اس خدمت کا بجالانا واجب نہیں ہے بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت تو ایسی ضرور ہی رہنی چاہیے جو خیر کی شمع روشن رکھے اور شر کی ظلمت کو دُفع کرتی رہے۔ اگر ایسی ایک جماعت بھی ان میں موجود نہ رہی تو خیر امت ہونا تو درکنار اس قوم کا عذاب الہی اور لعنت خداوندی سے بچ جانا بھی محال ہے۔